خود نوشت

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی رحمہ اللہ

جنگِ بلقان اور تحریکِ خلافت کے دنوں کی دلچسپ اور ولولہ خیز یادیں
جن میں ہندو لیڈروں کے اصل چہرے بھی نمایاں ہیں۔

تلخیص: عبدالمجید قریشی

وطن عزیز کے شگفتہ نگار ادیب اور معروف نعت گو شاعر حضرت حافظ لدھیانوی اپنی سرگزشت حیات "یادوں کے انمول خزانے" میں مجلس احرار اسلام کے رہنما اور برصغیر کے سحر بیاں اور شعلہ نوا خطیب مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم کے متعلق یوں رطب اللسان ہیں:

"مولانا حبیب الرحمٰن، لدھیانے کی ممتاز دینی اور سیاسی شخصیت تھے۔ مجلس احرار کے صدر اور کانگریس کے سرکردہ لیڈر تھے۔ سفید رنگ، مزاج میں انتہائی نفاست، گفتگو میں حسین اختصار، مجلسی زندگی میں جاذب نظر، لباس میں انتہائی سادگی و صفائی۔ ان کے لباس پر کبھی میلے پن کا احساس نہ ہوا۔ عموماً کھدر پہنتے۔ کھدر کا حسن ان کے پیکر پر نکھر جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے خوبصورت نقوش سے اس پیکر کو تراشا تھا۔

مولانا کی شخصیت میں قدرت نے عجب لچک رکھی تھی۔ وہی شخص جو بر سرِ منبر مردِ آہن نظر آتا تھا، مجلسی زندگی میں بہار کے جھونکے کی طرح لطیف اور شاخ گل کی طرح نرم و نازک دکھائی دیتا تھا۔ آواز میں گھن گرج جو جلسوں میں سنائی دیتی تھی، اس کا شائبہ بھی مجلسی زندگی میں نہ پڑتا تھا۔ ایسے دھیمے اور نرم آواز میں گفتگو کرتے کہ حیرت ہوتی تھی کہ یہ وہی شخص ہے جس کا طنطنہ، جس کا رعب، جس کا پروقار لہجہ حکومت کو سراسیمہ کر دیتا ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن، علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کے اس شعر کی حسین تفسیر تھے۔

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

"مولانا کا مکان ہمارے گھر سے قریب ہی تھا۔ جب کسی بزرگ یا کسی معروف ہستی کی آمد کی خبر ملتی تو

میں مولانا حبیب الرحمٰن کے مکان پر اس کی صحبت سے فیض یاب ہونے' اس کی گفتگو سے لطف اندوز ہونے' اس کی شخصیت سے علمی و ادبی استفادہ کرنے چلا جاتا۔ اس روز کالج سے لوٹا اور مولانا موصوف کے دولت کدے پر پہنچ گیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ دن کے چار بجے تھے۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی جوانی کا زمانہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے امیر شریعت کو جمال کا پیکر بنایا تھا۔ حسین خدوخال' بڑی بڑی مسحور کن آنکھیں' گھنگھریالے بال' ستواں ناک' چہرے سے وجاہت اور شرافت نمایاں' آواز میں داؤدی نغمہ تھا۔ جب کلام پاک کی تلاوت فرماتے تو غیر مسلم بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے۔ میں نے بے تکلفی سے مولانا حبیب الرحمٰن کے آگے سے چائے کی پیالی اٹھائی۔ شاہ جی نے آداب مجلس کے پیش نظر مجھے جلال سے دیکھا۔ میں لرز گیا۔ اتنے میں مولانا نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ شاہ جی کا جلال یکدم جمال میں بدل گیا۔ سمجھ گئے کہ یہ مولانا کا چہیتا ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن کے حلقہ درس میں نوجوان زیادہ شریک ہوتے۔ ان کی گفتگو' ان کے اخلاق' ان کے مجلسی آداب' ان کا کردار' غرض ان کی زندگی کا ہر لمحہ درس کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ کسی جلسے میں تقریر کرتے تو معلوم ہوتا کہ اس خوبصورت شخص کو اللہ تعالیٰ نے قوت ایمانی اور جذبہ صداقت سے نوازا ہے۔ فرنگی حکومت نے اس صداقت اظہار کی پاداش میں انہیں زنداں میں ڈالا' تکالیف پہنچائیں' قید تنہائی جیسی اذیت ناک سزا دی' مگر انہوں نے حق گوئی سے سرمو انحراف نہ کیا۔ انہیں پانچ سال قید تنہائی کاٹنا پڑی۔ اگر انسان ایک روز بھی اکیلا کمرے میں بند رہے تو اس کے لیے یہ لمحات سوہان روح بن جاتے ہیں پھر پانچ سال کا طویل عرصہ مولانا نے نہایت صبر و استقلال سے گزارا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را"

قائد احرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا مختصر مگر خوبصورت تعارف آپ نے ان کے ایک دیرینہ مداح حضرت حافظ لدھیانوی کے توسط سے ملاحظہ فرمایا۔ آئیے اب ہم اس مرد مجاہد کی خود نوشت سرگزشت حیات کی جانب رجوع کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ انہوں نے برصغیر پاک و ہند کی جنگ آزادی میں کیا کردار ادا کیا۔ یہ داستان انہی کے الفاظ میں سنئے:

☆☆☆

میری تاریخ پیدائش ۳؍جولائی ۱۸۹۲ء مطابق ۱۱۔ صفر ۱۳۱۰ھ ہے۔ میرے والد مولانا محمد زکریا اپنے والد مولانا عبدالقادر مجاہد جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے اکلوتے بیٹے تھے اور میں ان کا پہلا بچہ تھا' اس لیے دادا اور دادی کو پوتے سے جو قدرتی پیار ہونا چاہیے' وہ مجھے دادا' دادی کی آغوش میں میسر آیا۔ یہ دونوں مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ دادا صاحب مرحوم وقت کے فقیہ' ولی اور مجاہد تھے۔ وہ ہر وقت مجھے اپنے ساتھ رکھتے۔ جب میں کچھ بڑا ہوا تو مجھے تقریر اور وعظ سکھانے لگے۔ مجھے فرصت کے وقت منبر پر بٹھا کر خود مراقب ہو کر بیٹھ جاتے اور مجھ سے فرماتے کہ بیٹا تقریر کرو۔ میں دن بھر جو کچھ باتیں ان سے سنا کرتا وہی کہنا شروع کر دیتا۔ دادا صاحب کی تربیت اور توجہ کا یہ اثر ہوا کہ مجھے اسلام سے والہانہ محبت اور انگریز کی غلامی سے نفرت ہو گئی۔ دادا صاحب مرحوم ۱۹۰۳ء میں وفات پا گئے اور میں ان کی شفقت اور فیضان نظر سے محروم ہو گیا۔

میں نے قرآن مجید اور اردو کی ابتدائی تعلیم گھر کے مدرسے لدھیانے میں ہی پائی' لیکن بعد ازاں اس دور کے قرب و جوار کے مدرسوں میں حدیث'

تفسیر اور فقہ کی تعلیم کے لیے حاضر ہوتا رہا۔ اساتذہ میں نہایت شفیق اور مہربان مولانا نور احمد پسروری تھے۔ وہ کئی سال مکہ معظمہ میں قیام پذیر رہے تھے۔ وہ مولانا رحمت اللہ صاحب مہاجر مکی کے شاگرد اور حاجی امداد اللہ صاحب کے مرید تھے۔ مولانا نور احمد صاحب کے پڑھانے میں کچھ ایسی برکت تھی کہ سبق پڑھتے پڑھتے یاد ہو جاتا۔ انہوں نے مجھے ایک نابینا حافظ سے علم تجوید کے مطابق قرآن مجید پڑھنے کی مشق بھی کروائی جو مستقبل میں میرے لیے بڑی فیض رساں ثابت ہوئی۔

میں ۱۹۱۲ء تک مولانا نور احمد صاحب کے مدرسے ہی میں تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اس برس جنگ بلقان چھڑ گئی اور میں تعلیم سے فارغ ہو کر لدھیانے آ گیا۔ ترکوں اور یورپی مظالم کی خبریں پڑھ کر میں بہت بے چین رہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ انگریزوں کے خلاف کچھ کروں، لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کیا کروں۔ میں اپنی بے بسی پر گھنٹوں مسجد میں بیٹھ کر دعا کر کے رویا کرتا کہ کوئی راستہ انگریزوں کے خلاف کام کرنے کا ملے۔ ایک دن شہر کے چند نوجوان دوستوں سے اپنے جذبات کا اظہار کیا تو انہوں نے میری باتیں سن کر اسلامیہ اسکول لدھیانہ کے سامنے والے میدان میں جلسہ منعقد کرنے کا اعلان کر دیا کہ آج مولانا حبیب الرحمن کا وعظ ہو گا اور ترکوں کی ہمدردی میں تقریریں بھی ہوں گی۔ اس اعلان کا ہونا تھا کہ شہر کے ہندو، مسلمان ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے۔ جلسے میں شہر کے امراء، رؤسا، وکلا، ڈاکٹر غرض ہر طبقہ خیال کے لوگ موجود تھے۔ سی آئی ڈی کے رپورٹر بھی خاصی تعداد میں آئے ہوئے تھے۔ اسٹیج پر میں تھا یا میرے چند نوجوان ساتھی، کسی اور کو یہ توفیق یا ہمت نہ تھی کہ وہ اسٹیج پر آ کر بیٹھے۔ میری تقریر ترکوں کی حمایت میں تقریباً ایک گھنٹے تک ہوئی۔ تقریر سن کر لوگوں میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اپنی نوعیت کا یہ پہلا جلسہ تھا۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد میں گھر آ گیا۔ رات بھر مجھے بڑی خوشی رہی۔ اسی رات والد صاحب کے پاس ان کے ایک دوست آئے اور کہا کہ آپ کے صاحبزادے دادا پردادا کے رنگ پر جا رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان پر جذبہ شہادت سوار ہے۔ پھانسی سے کم ان کو سزا نہ ہو گی۔ اس لیے آپ انہیں مناسب طریقے پر چلائیے۔ حالات ایسے نہیں کہ اتنی تیزی دکھائی جائے۔ والد صاحب نے ان سے تو کچھ نہ کہا، لیکن دوسری صبح مجھے ساتھ لے کر دیوبند روانہ ہو گئے۔

مجھے مولانا حبیب الرحمن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی سرپرستی میں دارالعلوم میں داخل کرا دیا گیا۔ والد صاحب نے میری تقریر کا قصہ بھی مہتمم صاحب کو سنا دیا، لیکن انہوں نے اس بارے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ مولانا حبیب الرحمن نے میری دیکھ بھال اور نگرانی کچھ ایسے انداز سے کی جس کی وجہ سے میں ان کو اپنا پہلا سیاسی استاد مانتا ہوں۔ وہ میرے جذبات کی بڑی قدر کرتے اور مجھے سیاسی رموز و نکات سمجھایا کرتے بلکہ میں نے اکثر پرانے بزرگوں کے سیاسی حالات بھی ان سے سنے۔ دارالعلوم دیوبند میں مجھے بڑا اطمینان اور سکون قلب حاصل ہوا۔ ویسے بھی دارالعلوم میں اندرونی طور پر نہایت گہری سیاسی تنظیم اور تحریک چل رہی تھی جو میرے جذبات کے عین مطابق تھی۔

تعلیم کے سلسلے میں میرے اسباق شیخ الاسلام خاتم المحدثین مولانا انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تھے۔ مجھے فہم قرآن اور علم حدیث میں جو کچھ بھی میسر آیا وہ سب حضرت شاہ صاحب کی خاص توجہ اور فیضان صحبت کا نتیجہ ہے۔ سبق کے بعد ان کی خدمت میں حاضر رہتا اور وہ بھی بڑی شفقت و محبت

سے مجھے خدمت کا موقع دیتے۔ حضرت شاہ صاحب کو میری طالب علمی کے زمانے ہی سے مجھ سے اور میرے خاندان سے اس قدر انسیت پیدا ہوگئی تھی کہ سال میں ایک مرتبہ لدھیانے ضرور تشریف لاتے اور کئی کئی دن ہمارے ہاں قیام فرماتے۔ ایک مرتبہ میں جیل میں تھا کہ حضرت شاہ صاحب بلا کسی اطلاع کے تشریف لائے۔ بیٹھک میں سامان رکھا اور اپنے خادم کے ہمراہ خود ہی بیٹھک کی صفائی فرمانے لگے۔ میری لڑکی کو معلوم ہوا تو معذرت کی اور بیٹھک کی صفائی کرنے لگی۔ حضرت شاہ صاحب فرمانے لگے کہ بٹی یہ میرا گھر ہے اور گھر والے اپنے گھر کی خود ہی صفائی کیا کرتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب نے تحریک خلافت کے زمانے سے لے کر تحریک احرار کے زمانے تک میری اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی سرپرستی فرمائی۔ انہوں نے قادیانیوں کے بارے میں جماعت احرار کا نقطہ نظر اور اسلام میں ختم نبوت کی بنیادی اہمیت سمجھانے کے لیے ڈاکٹر اقبال سے ملاقات کی اور ان کو ختم نبوت کے متعلق اپنا رسالہ پڑھ کر سنایا۔ اس کے فوراً بعد ہی ڈاکٹر اقبال نے کشمیر کمیٹی کی رکنیت سے استعفا دے دیا جس کے صدر مرزا بشیر الدین محمود قادیانی تھے۔ بعد ازاں ڈاکٹر صاحب نے قادیانیوں کے خلاف متعدد مضامین لکھے۔ ڈاکٹر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ علم و فضل میں شاہ صاحب سے بڑا شخص میری نظر سے نہیں گزرا۔

انہی دنوں حضرت علامہ انور شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے انجمن خدام الدین لاہور کے مشہور جلسے میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو "امیر شریعت" کا خطاب دیا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا اعلان فرمایا۔ اعلان کے بعد جب حضرت شاہ صاحب نے سید عطاء اللہ شاہ صاحب کی طرف بیعت کے لیے ہاتھ بڑھایا تو انہوں نے بڑے رقت آمیز لہجے میں فرمایا کہ حضرت مجھے اپنے دست مبارک پر بیعت ہونے کی اجازت دیجئے' لیکن شاہ صاحب مصر رہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو جمعیت علمائے ہند کے ایک جلسے میں حضرت شاہ صاحب نے "امام الہند" کے خطاب سے نوازا۔ انہوں نے علما کی بھری محفل میں فرمایا کہ میں مولانا آزاد کو "امام الہند" کے خطاب کا مستحق سمجھتا ہوں۔ مولانا آزاد کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی مولانا انور شاہ صاحب دہلی تشریف لاتے' مولانا آزاد ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور گھنٹوں باادب دوزانو ہو کر ان کے سامنے بیٹھے رہتے۔ ایک مرتبہ مولانا آزاد' ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر ٹھہرے ہوئے تھے' معلوم ہوا کہ حضرت شاہ صاحب ان سے ملاقات کے خواہش مند ہیں۔ انہوں نے فوراً اپنی مصروفیات ترک کر دیں اور ان کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

دیوبند کے زمانہ تعلیم میں مفتی عزیز الرحمٰن صاحب' مولانا سراج احمد صاحب' میاں اصغر حسین صاحب' مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب' غرض سب بزرگ اس وقت حیات تھے۔ ہر نئے آنے والے کو وہاں نورانیت کا احساس ہوتا۔ دارالعلوم کے طلبہ کی اکثریت صاحب نسبت اور شب بیدار تھی۔ مدرسین کی یہ خواہش رہتی تھی کہ جو طالب علم بھی مدرسہ دیوبند سے فارغ ہو' وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ عملی زندگی کا بھی بہترین نمونہ بن کر نکلے اور جو ہر تابدار کی طرح دنیا میں چمکے۔

میں ۱۹۱۹ء کے شروع میں مولانا شبیر احمد عثمانی کے ساتھ سیاسی جلسوں میں مولانا حبیب الرحمٰن مہتمم کی اجازت اور حضرت شاہ صاحب کے ارشاد پر جانے لگا۔ والد صاحب کو خبر ہوئی تو وہ دیوبند تشریف لائے اور مولانا حبیب الرحمٰن سے میرے سیاسی کام کرنے کے بارے میں بات کی۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ کے

صاحبزادے پھانسی سے تو بچ گئے ہیں' لیکن جیل سے نہیں بچ سکتے' اس لیے انہیں سیاسی کام سے روکنا مناسب نہیں۔ اور اس طرح میری سیاسی زندگی کا آغاز ہو گیا۔ بقول حضرت جگر مراد آبادی۔

یوں بسر کی زندگی ہم نے اسیری میں جگر
ہر طریقہ داخل آداب زنداں ہو گیا

۱۹۱۹ء میں جب گاندھی جی نے کانگرس کی تحریک ستیہ گرہ کا آغاز کیا تو جلیاں والا باغ امرتسر میں ہزاروں بے گناہ ہندو' مسلمان اور سکھ انگریزوں نے مشین گنوں سے بھون دیے۔ پورے ہندوستان میں کہرام مچ گیا اور انگریزوں کے خلاف ہندوستان میں جذبات بھڑک اٹھے۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں کانگرس کا اجلاس امرتسر میں ہوا۔ اس کے ساتھ مسلم لیگ اور جمعیت علما کے اجلاس بھی وہیں منعقد ہوئے۔ یہ تینوں جماعتیں انگریز دشمنی میں ایک ہی راستے پر گامزن تھیں۔ مسلم لیگ کے اجلاس میں یہ تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوئی کہ مسلمانوں کو گائے کی قربانی بند کر دینی چاہیے۔ علی برادران بھی اسی موقع پر جیل سے سیدھے امرتسر پہنچے۔ تمام جماعتوں اور امرتسر کے ہندوؤں' مسلمانوں اور سکھوں نے ان دونوں بھائیوں کا نہایت شاندار اور تاریخی استقبال کیا۔

امرتسر ان دنوں ہندو' مسلم اور سکھ اتحاد کا ایک یادگار مرکز بن چکا تھا۔ کانگرس کے پنڈال کے باہر ہزارہا مسلمان پانچوں وقت باجماعت نماز پڑھتے اور ہندو اور سکھ رضاکار نماز کے انتظامات کرتے۔ پنڈت مدن موہن مالویہ نے رات کو کانگرس کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آج مسلمانوں کو باجماعت نماز پڑھتے دیکھ کر میرے دل و دماغ پر روحانی کیفیت طاری ہو گئی۔

امرتسر کا اجلاس ہندوؤں' مسلمانوں اور سکھوں کے اتحاد کی ایسی تاریخ ہے جو پھر کبھی دہرائی نہیں جا سکی۔ شہیدان جلیاں والا کے خون نے ہندوستانیوں کو ایک ایسے رنگ میں رنگ دیا تھا جس کے اثرات سے انگریزی حکومت گھبرا گئی اور اچانک وائسرائے ہند نے ایک آرڈیننس جاری کیا کہ جو شخص خلافت' کانگرس اور جمعیتہ العلما کا والنٹیر بنے گا اس کو چھ ماہ قید اور جو والنٹیر بنائے گا اس کو تین سال کی قید ہو گی۔ گاندھی جی نے جب آرڈیننس کو پڑھا تو مارے خوشی کے ان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ خدا کا شکر ہے انگریز نے ستیہ گرہ تحریک کے لیے خود ہی دروازہ کھول دیا ہے۔ اس کے بعد گاندھی جی نے ملک میں سول نافرمانی کی تحریک کا اعلان کر دیا۔

لاہور کانگرس کے دفتر سے لالہ لاجپت رائے' آغا محمد صفدر' ملک لال خاں اور لالہ دھنی چند انبالوی گرفتار کر لیے گئے۔ لاہور کے بعد لدھیانے میں سول نافرمانی اور گرفتاریوں کا دور شروع ہوا اور ماسٹر تاج الدین انصاری والنٹیروں کے جتھے کے ہمراہ جس میں ہندو' مسلمان اور سکھ نوجوان شریک تھے' بازار میں نکلے۔ یہ پنجاب میں والنٹیروں کا پہلا بیج تھا جو گرفتار ہوا۔ دوسرے دن میرے چھوٹے بھائی مولانا محمد یحییٰ فاضل دیوبند دو سو رضاکاروں کو ساتھ لے کر سول نافرمانی کرتے ہوئے گرفتار ہو گئے۔ تیسرے روز لدھیانے کے مدرسہ نابینا کے ایک سو حافظ قرآن طلبہ نے اپنے استاد مولانا محمد یسین کی سرکردگی میں سول نافرمانی کی۔ اندھوں کی سول نافرمانی کے اقدام نے سارے شہر میں آگ لگا دی اور حکومت خوف زدہ ہو گئی۔ حکومت نے صرف مولانا محمد یسین کو گرفتار کیا اور اندھوں کو کوتوالی لے جا کر چھوڑ دیا گیا۔ غرض دس روز میں تین ہزار کے قریب ہندو' مسلمان اور سکھ رضاکار جیل میں پہنچ گئے۔ بعد ازاں ایک جلوس برقع پوش مسلمان خواتین کا بھی نکلا' مگر پولیس انہیں

گرفتار کرنے کی ہمت نہ کر سکی۔

میں ان دنوں لدھیانے سے باہر تھا۔ جوں ہی واپس آیا، اسی رات میری تقریر کے لیے ایک شاندار جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ اپنی تقریر میں لوگوں کو میں نے دو نعرے لگانے کی تلقین کی۔ یہ دو نعرے "ہندو مسلم بھائی بھائی" اور "انقلاب زندہ باد" تھے۔ میرا خیال تھا کہ مجھے راتوں رات گرفتار کر لیا جائے گا، مگر ایسا نہ ہوا، تاہم اگلی صبح میری گرفتاری کا وارنٹ لے کر پولیس میرے مکان پر پہنچ گئی۔ پولیس افسران چاہتے تھے کہ مجھے ہتھکڑی لگائے بغیر جیل لے جائیں، مگر میں نے انکار کر دیا۔ مجبوراً پولیس کو ہتھکڑی لگانا پڑی۔ لوہے کی زنجیریں جب میرے ہاتھوں میں ڈالی گئیں تو مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ سچائی اور آزادی کے راستے میں کام کرنے والے اہل حق اور مجاہدین کی سنت ادا کر رہا ہوں۔

میری گرفتاری پر شہر میں جوش پھیل گیا۔ ہزاروں لوگ آن کی آن میں والنٹیر بن گئے۔ شہر کا شہر پولیس کے قابو سے باہر ہو گیا۔ ان حالات کو دیکھ کر میرا مقدمہ جیل ہی میں چلایا گیا اور ایک ہندوستانی مجسٹریٹ نے مجھے چھ ماہ قید سخت اور ایک ہزار روپے جرمانے کی سزا دی۔ فیصلے کے بعد مجسٹریٹ نے میرے کان میں کہا کہ یہ سزا بہت سخت ہے، لیکن ڈپٹی کمشنر کا یہی حکم تھا، مجبور ہوں۔

لدھیانہ جیل کے سپرنٹنڈنٹ "کرنل دیوان حکومت رائے" تھے۔ انہوں نے بڑی جرات اور شرافت کے ساتھ سیاسی قیدیوں کو جیل میں رکھا۔ ان کے حسن سلوک کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

لدھیانہ جیل میں چند ہی دن گزرے تھے کہ مجھے، میرے بھائی محمد یحییٰ اور ماسٹر تاج الدین انصاری کو انبالہ جیل منتقل کر دیا گیا۔ میرا اور میرے ساتھیوں کا سامان باندھا گیا۔ ہم ریلوے اسٹیشن پہنچے ہی تھے کہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ وہاں آن پہنچے اور "زندہ باد" کے نعروں سے اسٹیشن کی فضا گونج اٹھی۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس لوگوں کا ہجوم دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس نے تین بار ڈنڈوں اور لاٹھیوں کے زور سے پلیٹ فارم خالی کرانے کی کوشش کی، لیکن ہجوم پہلے سے زیادہ تن کر کھڑا ہو گیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس خود تین بار ہجوم کی جانب دوڑا اور اس کشمکش میں گرنے تک کی نوبت آ گئی۔

انبالہ جیل میں پہنچے دو ہی دن ہوئے تھے کہ ہم تینوں کا تبادلہ میانوالی جیل کر دیا گیا۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو علیحدہ علیحدہ کوٹھڑیوں میں رکھا گیا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ کون کہاں ہے۔ بڑی رازداری سے کام لیا جا رہا تھا۔ اس وقت جیل میں ستر کے قریب قیدی آ چکے تھے، مگر ان کو ہماری خبر تھی نہ ہمیں ان کی۔ غرض ہم ایسی جگہ تھے کہ بقول غالب۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کوئی اپنی خبر نہیں آتی

میانوالی جیل سیاسی قیدیوں کے لیے کالا پانی بنی ہوئی تھی۔ اس جیل کا سپرنٹنڈنٹ نرم خو، لیکن جیلر بہت سخت تھا۔ یہاں سب سے پہلے مولانا سید حبیب ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" لاہور تشریف لائے تھے۔ ان کے بعد اس جیل کی چار دیواری میں مولانا احمد سعید ناظم جمعیت علمائے ہند اور عبدالعزیز انصاری ایم اے داخل ہوئے۔ ان حضرات سے بان بٹنے کی مشقت لی جاتی تھی۔ بعد ازاں اس جیل میں ڈاکٹر ستیاپال، لالہ شنکر لال دہلوی، لالہ دیش بندھو گپتا، مولانا عبداللہ چوڑی والے، پنڈت نیکی رام شرما، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا اختر علی خاں، مولوی لقاء اللہ پانی پتی، مولانا عبدالمجید سالک اور سوامی شردھانند بھی آ گئے۔

جیل میں تمام ہندو' مسلمان اور سکھ قیدی بھائیوں کی طرح رہتے۔ قیدی حضرات سب اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے' اس لیے میانوالی جیل ان کی موجودگی سے مجلس علم و ادب میں تبدیل ہو گئی' بقول عبدالمجید سالک جیل کی زندگی ہنسی خوشی اور تعلیم و تفریح میں گزرنے لگی۔ نماز باجماعت ادا کی جاتی۔ صبح کی چائے کے بعد مولانا احمد سعید درس و تدریس میں مشغول ہو جاتے۔ مولانا داؤد غزنوی انگریزی پڑھتے۔ مولانا سید حبیب' عربی اور لالہ دیش بندھو گپتا' فارسی میرے بھائی یحییٰ سے پڑھتے۔ دوسروں نے مطالعے کا مشغلہ اختیار کیا اور اس طرح جیل کی تلخیوں پر آرام سے قابو پا لیا۔

جیل میں علیحدہ علیحدہ دو لنگر تھے۔ ایک میں ہندوؤں کے لیے اور دوسرے میں مسلمانوں کے لیے کھانا پکتا' لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد اکثر ہندو دوست اپنے لنگر کو چھوڑ کر ہمارے لنگر میں شامل ہو گئے' اس لیے کہ مسلمانوں کے لنگر کا انتظام بہت اچھا تھا۔ گوشت کے علاوہ سبزی اور دال بھی بہت عمدہ پکائی جاتی تھی۔ دہلی کے مولانا عبداللہ چوڑی والے ہمارے لنگر کے منتظم تھے۔ انہیں دہلی کے کھانے پکانے میں خاص ملکہ تھا۔

میانوالی جیل میں مسلمانوں کے دسترخوان میں ہندو نوجوانوں کی شمولیت' ان کی آزاد خیالی اور چھوت چھات سے نفرت سوامی شردھانند کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی۔ انہوں نے پہلے تو ہندوؤں کو مسلمانوں کے دسترخوان پر ساتھ کھانے سے منع کیا اور کہا کہ آپ لوگ مسلمان ہوتے جا رہے ہیں۔ سوامی شردھانند کے نزدیک ہندوؤں کا مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا' کھانا مسلمان ہونے کے برابر تھا' لیکن ہندو نوجوانوں نے سوامی جی کی بات نہ مانی۔ اس ناکامی کے بعد انہوں نے اعلان کر دیا کہ اگر تحریک خلافت اور ستیہ گرہ کے یہی معنی ہیں کہ دسترخوان پر ہندو' مسلمان کی تفریق ختم ہو جائے تو میں آزادی ہند کی ایسی تحریک سے متفق نہیں' چنانچہ انہوں نے سول نافرمانی کی تحریک سے اپنا اقدام واپس لے لیا اور نہایت ڈرامائی انداز میں رہا ہو گئے۔ جیل سے رہا ہوتے ہی انہوں نے شدھی سنگھٹن کا فتنہ کھڑا کر دیا اور مسلمانوں کو مرتد کرنے کی کوششیں کرنے لگے۔

وقت انتہائی اطمینان سے گزر رہا تھا کہ اچانک مجھے میانوالی سے دھرم سالہ جیل تبدیل کر دیا گیا۔ میں اس حکم سے بہت دلبرداشتہ ہوا کہ اچھے ساتھیوں کی صحبت اور پرلطف علمی مجالس سے محروم ہو جاؤں گا' لیکن قہر درویش بر جان درویش کے مصداق دھرم سالہ جانا پڑا۔ وہاں پہنچا تو مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ وہاں پنجاب کے مشہور سیاسی رہنما لالہ لاجپت رائے بھی موجود ہیں۔ لالہ صاحب جگراؤں ضلع لدھیانہ کے رہنے والے تھے۔ اس لیے کچھ ان سے وطنی تعلق اور کچھ ان کی بزرگی' میں نے ان کی بھرپور خدمت کی اور یوں میرے مشفق بلکہ دوست بن گئے۔

لالہ جی سے سیاسی معاملات پر اکثر تبادلہ خیال ہوتا رہتا۔ مجھے ان سے بہت سی معلومات حاصل ہوئیں۔ لالہ جی میرے غور و فکر کی بڑی قدر کرتے اور میرے حافظے کی داد دیتے۔ انہوں نے مجھ سے کئی بار کہا کہ آپ مجھ سے انگریزی پڑھ لیجئے' ملکی سیاست میں آگے چل کر انگریزی زبان آپ کی بڑی مدد کرے گی۔ میں جواب میں کہتا کہ مجھے انگریز اور انگریزی دونوں سے غلامی کی بو آتی ہے اور میں بدبو سے دور ہی رہنا چاہتا ہوں۔ اس پر لالہ جی کہتے تمہارا یہ جذبہ قابل قدر ہے۔ تمہارے اس یقین پر مجھے رشک آتا ہے۔ لالہ جی کے ساتھ رہتے ہوئے ابھی تین ماہ گزرے تھے کہ مجھے دھرم سالہ جیل سے لدھیانہ جیل منتقل کر دیا گیا۔

لدھیانہ جیل میں ڈپٹی کمشنر مسٹر ہلٹن ملنے آئے اور مجھ سے کہا کہ مولانا صاحب' شہر کے لوگ آپ سے ملاقات کے بہت مشتاق ہیں۔ آپ اگر ضمانت پر رہا ہو جائیں تو آپ کے لیے بہت بہتر ہو گا۔ اس طرح لوگوں کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی اور مقدمے کی پیروی بھی آپ آسانی سے کر سکیں گے۔ میں انگریز کی چال بازی اور سیاست کو خوب سمجھ گیا۔ میں نے کہا کہ میں حکومت کا باغی ہوں' میری ضمانت کون دے گا؟ ڈپٹی کمشنر نے جواب دیا کہ ضمانت کا انتظام میں کرائے دیتا ہوں۔ میں نے کہا: "جناب آپ کی شفقت اور مہربانی کا شکریہ' لیکن میں آپ کی نیت کو بخوبی سمجھتا ہوں۔ آپ ضمانت کی آڑ میں میرے سیاسی کردار کو داغ دار کرنا چاہتے ہیں' اس لیے میں ضمانت پر رہا ہونے کے لیے تیار نہیں۔" ڈپٹی کمشنر کو میرے اس جواب سے مایوسی تو ہوئی' لیکن اس کے دل میں میری عزت پیدا ہو گئی۔ وہ حاکمانہ انداز چھوڑ کر دوستانہ انداز میں گفتگو کرنے لگا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اگر کوئی بات میرے لائق ہو تو بتایئے۔ میں نے کہا کہ میری صرف ایک خواہش ہے کہ مجھے دوبارہ دھرم سالہ جیل بھیج دیا جائے۔ ڈپٹی کمشنر نے وعدہ کیا اور ہفتے عشرے میں مجھے واپس دھرم سالہ بھیج دیا گیا۔

لدھیانہ جیل کے آٹھ دس روزہ قیام کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ ایک ہزار روپے جرمانے کی وصولی کے سلسلے میں میرے گھر کا تمام سامان' بیوی' بچیوں کے معمولی زیورات یعنی کانوں کی بالیاں تک اتروا کر گورنمنٹ نے ضبط کر لی ہیں۔ میری بیوی اور بچیاں مجھ سے ملنے آئیں تو ان کو سامان کی ضبطی یا زیورات کے چھن جانے کا کچھ ملال نہ تھا بلکہ میری بیوی نے اس بات کا مجھ سے کوئی ذکر ہی نہ کیا۔ میں اپنی بیوی کی اس بہادری اور اطمینان کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ یہ خاندانی اثر تھا کیونکہ ان کے والد مولانا عبدالعزیز خود ۱۸۵۷ء کو خوفناک مصائب سے گھر چکے تھے۔

میں دھرم سالہ جیل پہنچا تو لالہ لاجپت رائے مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ مجھے یہاں آئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ شیخ حسام الدین امرتسری انبالہ جیل سے دھرم سالہ آن پہنچے۔ اب ہم تین قیدی ہو گئے اور وقت بہت آرام و اطمینان سے گزرنے لگا۔

لالہ لاجپت رائے اردو اور فارسی کے بڑے اچھے عالم تھے۔ ڈاکٹر اقبال کا اکثر کلام انھیں زبانی یاد تھا۔ علامہ کی نظم "خضر راہ" کو وہ بہت شوق سے پڑھتے تھے۔ ہندو مسلم مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے' خاص طور سے پنجابی مسلمانوں اور ہندوؤں کے تعلقات کے بارے میں ان کی یہ رائے تھی کہ مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی اور ہندوؤں کی اقتصادی برتری ملک میں ہندو مسلم اتحاد کو زیادہ دیر نہ چلنے دے گی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر پنجاب کے ہندوؤں نے سود لینا نہ چھوڑا' دیہات میں لڑکیوں کو رہن رکھنے سے باز نہ آئے' مسلمانوں کو اپنی منڈیوں میں جگہ نہ دی تو پنجاب کے ہندوؤں کو ایک نہ ایک دن اس قدر نقصان اٹھانا پڑے گا جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہندو مسلم فسادات کو وہ سرمایہ داری اور غربت کی جنگ قرار دیتے تھے' چنانچہ جیل سے نکلتے ہی لالہ جی نے پنجاب کے ہندوؤں کو اقتصادی بنیادوں پر بہت کچھ سمجھایا' لیکن ان کی بات کسی نے نہ مانی۔

انگریزی دور میں ہندوستانی جیلوں میں اس وقت درجہ بندی نہ تھی۔ پھر بھی لیڈر حضرات کو کچھ نہ کچھ مراعات ضرور حاصل تھیں' لیکن رضاکار قیدیوں کا برا حال تھا۔ ان پر جو ظلم و ستم توڑا جاتا اسے بیان کرتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ میں جب پہلے پہل لدھیانہ جیل میں داخل ہوا تو اس وقت تقریباً تین سو رضاکاروں نے جیل حکام کے روپے کے

خلاف بھوک ہڑتال کی ہوئی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا اور میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ میں نے کوشش کی کہ جیل حکام اور رضاکاروں میں صلح ہو جائے۔ اس مہم میں مجھے کامیابی ہوئی اور جیل حکام کو رضاکاروں کے سامنے جھکنا پڑا۔ رضاکاروں کو جیل کے باہر سے چیزیں منگوانے کی اجازت دے دی گئی اور یہی رضاکاروں کا مطالبہ تھا' لیکن چھ سات دن کے بعد جیل حکام پھر بدعہدی پر اتر آئے۔ اس روز جیل کے لنگر میں جو دال پکائی گئی اس میں نہ صرف بہت سی مرچیں بلکہ پرانے جوتے بھی ڈال دیے گئے۔ اس دال کو دیکھ کر رضاکاروں میں پھر جوش پھیل گیا۔ یہ دال لے کر وہ میرے پاس آئے۔ ان کا غیظ و غضب دیکھ کر میں نے سوچا کہیں رضاکار تشدد پر نہ اتر آئیں اور یہ امر لڑائی کا پیش خیمہ نہ بن جائے' چنانچہ میں نے ذرا سخت انداز میں ان سے کہا کہ یہ جیل ہے' یہاں گھر کی طرح کھانے نہیں مل سکتے۔ یہ کہہ کر میں دال کا پیالہ اٹھا کر پی گیا۔ میرے اس عمل نے رضاکاروں کے جذبات ٹھنڈے کر دیئے' لیکن یہ بدبودار دال اور وہ بھی زیادہ مقدار میں پینے سے میرے معدے کا نظام بگڑ گیا اور مجھے خونی پیچش ہو گئی۔ مجھے چودہ دن تک خون کے دست آتے رہے۔ بڑی مشکل سے سول سرجن نے اس پر قابو پایا۔ دھرم سالہ جیل جا کر بھی خاصے دنوں علاج ہوتا رہا' لیکن اس بیماری نے ایسی جڑ پکڑی کہ ذرا سی بدپرہیزی سے دست آنے لگتے یا شدید قسم کا قبض ہو جاتا۔ اس ایک بیماری سے بعض دوسری بیماریاں بھی لاحق ہو گئیں۔ کھانے کا ذائقہ ختم ہو گیا۔ پرہیز اس درجے کا کہ مجھے سرخ مرچ کھائے پورے پینتیس سال ہو گئے۔ صرف نمکین شوربہ اور سبزیاں کھاتا ہوں۔

عرصہ قید و بند گزار کر جب میں رہا ہوا اور لدھیانے پہنچا تو گھر کی تباہی دروازے ہی سے نظر آ رہی تھی۔ گھر کی کچی چار دیواری گر چکی تھی اور میری اہلیہ نے رسی باندھ کر اس پر ٹاٹ کے پردے ڈال دیے تھے۔ آخر آہستہ آہستہ میں نے گھر کا کچھ سامان درست کیا اور اس طرح پھر گھر کی زندگی کچھ چلنے لگی' لیکن یہ ایک وقفہ تھا۔

یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر ☆

(بشکریہ اردو ڈائجسٹ لاہور جون ۱۹۹۵ء)

اپنے عطیات اور زکواۃ و صدقات

مدرسہ معمورہ ملتان

کو عنایت فرمائیں

مدرسہ میں رہائش پذیر طلباء کے اخراجات اور

نئی درسگاہوں اور رہائشی کمروں کی تعمیر کے لئے اہل خیر حضرات فوراً توجہ فرمائیں

ترسیل زر کا پتہ

بذریعہ منی آرڈر:۔ سید عطاء المحسن بخاری۔ مہتمم مدرسہ معمورہ

دار بنی ہاشم مہربان کالونی۔ ملتان۔ فون:۔ 511961

بذریعہ بینک:۔ اکاؤنٹ نمبر 29932 حبیب بینک حسین آگاہی ملتان۔